سلسلہ مطبوعات ۶۴

عزیمت

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن

سلسلہ مطبوعات ۶۴

عزیمت

سیریز نمبر 8

زیرسرپرستی

مفکر کتاب وشریعت، شیخ تزکیہ وطریقت، رہبر سیاست وعزیمت، داعی شعور وحکمت

حضرت مولانا

شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی

مسند نشین خانقاہ عالیہ رحیمیہ قادریہ عزیزیہ رائے پور

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمن

مدیر

مولانا مفتی عبدالخالق آزاد

مجلس ادارت

جناب محترم محمد اسلوب قریشی

محترم سید اصغر علی شاہ بخاری

مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی

ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی

مولانا محمد مختار حسن

پیشکش

شاہ ولی اللہ کا نظریہ انقلاب ...... مولانا عبیداللہ سندھی 5
وفاق کے مدارس کا کردار ...... انس حسان 16

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن
پوسٹ بکس نمبر 938
پوسٹ آفس گلگشت ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاہ ولی اللہ کا نظریہ انقلاب

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

تمدن انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اور اس کی تشکیل کیلئے وہ کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں ان کا ظہور تمدن کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک الگ تھلگ جزیرے میں اگر مرد اور عورت ہوں تو وہ خود اپنے طبائع سے تمدن کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں اس طرح جو تمدن معرض وجود میں آتا ہے۔ وہ اس وقت تک صحت منداور صالح رہتا ہے۔ جب تک کہ اس سے افراد معاشرہ کی اکثریت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ لیکن جب ان میں معاشرتی ناہمواری افراط وتفریط کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور ایک طبقہ کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور دوسرا ادنیٰ ضرورتوں تک سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو یہ تمدن برباد کیے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑے تو پھر اس میں انقلاب کا آنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب کے نزدیک، کاسب طبقے کی کمائی پر غیر کاسب طبقے کا قبضہ کر لینا شریعت کے خلاف ہے۔ اسی طرح خود کاسبوں کے ایک گروہ کا ان کے دوسرے گروہ کی کمائی کا زیادہ حصہ ہتھیا لینا بھی ناجائز ہے۔

جب کسی معاشرے میں یہ حالت ایک وبائی شکل اختیار کر لے اور معاشی ناہمواری کی افراط وتفریط اس کا عام معمول بن جائے تو اس میں حتمی طور سے انقلاب آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس

معاشرے کا ایک گروہ تو انقلاب کا مبلغ بنتا ہے اور دوسرے اس کے ہمدرد ہو جاتے ہیں۔ بیشک ان ہمدردوں کے اخلاق واطوار کا اثر اس انقلاب کے مظاہر پر پڑتا ہے۔ لیکن جہاں تک اس انقلاب کی روح کا تعلق ہے۔ اس کا ترجمان وہی گروہ ہوتا ہے جو انقلاب کا مبلغ وقائد ہے۔

ہر انسان کو اپنا رزق خود پیدا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ کسی وجہ سے معذور ہے تو وہ بات دوسری ہے۔ ایک انسان کا خود اپنی روزی پیدا کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ اب ایک گھرانہ ہے جس میں کمانے والے کم اور کھانے والے زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ گھرانا جلد یا بدیر تباہ ہوگا۔ اسی طرح جس معاشرے میں کاسب کم ہوں اور کھانے والے زیادہ، وہ معاشرہ روگی ہے، اور اس کا ختم ہونا لابدی ہے، لیکن اگر ایک معاشرے میں کاسب زیادہ ہیں لیکن ان کی محنت سے جو دولت پیدا ہوتی ہے اسے منتظمین کا ایک مخصوص طبقہ دوسروں سے زیادہ لے لیتا ہے۔ یعنی حق کسب سے حق انتظام بہت زیادہ ہے، تو اس صورت میں بھی یہ معاشرہ غیر صالح ہے۔ اور اس کا جان بر ہونا مشکل ہے۔

غرض انسانیت کے فساد کی سب سے بڑی وجہ یہی معاشی ناہمواری کی افراط وتفریط ہے، اس سے جہاں ایک طرف فقر وفاقہ اور عیش وعشرت عام ہوتی ہے وہاں دوسری طرف اخلاق بھی بگڑتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی حالات کے اثرات قبول کرتے ہیں۔ اسی لیے ہم عام مرفہ الحالی اور لوگوں کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے معاملے میں بہت حد تک اشتراکیوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انسانوں میں جو اخلاق (ان کے عام معنوں میں) اور تفکر کی قوتیں ہیں، ان کی تربیت کیسے ہو، بے شک ہم چاہتے ہیں کہ انسانوں کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس عنصر کو جو اخلاق اور تفکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

بات یہ ہے کہ اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی نظام پائدار نہیں ہوسکتا، چنانچہ جہاں ہم

استحصال پسند سرمایہ داروں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے معاشرے کے بہت بڑے حصے کو معاشی لحاظ سے محتاج رکھ کر انسانیت کی سطح سے گرا دیا ہے وہاں ہمارا دوسرا الزام ان پر یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کے اس بڑے حصے میں سے اس طبقے کو جو اخلاق اور فکر کو ترقی دے سکتا تھا محتاج بنا کر اس قابل نہ رہنے دیا۔ چنانچہ اس لحاظ سے استحصال پسند سرمایہ داروں کا قصور دوہرا ہے۔ بدقسمتی سے جب کسی وجہ سے معاشرے کا وہ طبقہ جو اخلاق اور فکر کو ترقی دینے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لے سکتا تو اس کی یہ صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہوتی ہیں۔ جن کی پہلی شکل تملق اور چاپلوسی ہے۔ اس کے ذریعہ وہ طبقہ بڑوں کی خوشامد کرتا اور اس طرح اپنی معاشی احتیاجات پوری کرتا ہے۔ یہی مرض آگے چل کر غیر اللہ کی عبادت کا موجب بنتا ہے۔ اس منزل میں نفس ناطقہ کے ذاتی خواص سارے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اور انسانیت فاسد ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کو برباد کرنے کے قدرتی اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم انقلاب کا نام دیتے ہیں۔

قرآن مجید میں انبیاء کے جو قصے ہیں، وہ اسی قسم کے انقلاب کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالمگیر انقلاب کے داعی تھے جس کا ایک مثالی نمونہ آپؐ نے اپنی زندگی میں سرزمین حجاز میں قائم کر کے دکھایا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہؓ اس انقلاب کے دائرے کو اور وسیع کرتے ہیں اور ان کے عہد میں وہ سلطنتیں جو فسادِ انسانیت کا باعث تھیں۔ ختم ہو جاتی ہیں اور صحت مند انسانیت کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتابوں میں آپکو اسلام کے اس تاریخی کردار کے بارے میں اس طرح کے افکار ملیں گے۔ جنہیں وہ اپنی کتابوں میں بار بار بیان کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک انبیاء کا کام فسادِ انسانیت کو ختم کر کے صالح انسانیت کے لئے سازگار حالات پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ آئمہ انقلاب ہوتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام

سب سے بلند ہے اور وہ اس لیے کہ آپ کی دعوت سب سے زیادہ عالمگیر ہے۔

اب ایک طرف آپ کو حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں یہ افکار ملتے ہیں اور دوسری طرف وہ ان مفاسد کا ذکر کرتے ہیں۔ جو ان کے زمانے میں عام ہو گئے تھے۔ اور جنہوں نے انسانیت عامہ کو خراب کر دیا تھا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شاہ صاحب کے نزدیک ان مفاسد کا علاج وہی ہے جو اس سے پہلے انبیائے کرام کے ذریعہ ہو چکا ہے۔ اور جس کا ایک اعلیٰ نمونہ اسلام کا وہ تاریخی کردار ہے جو عہد نبویؐ اور دورِ خلافت راشدہ میں وجود میں آیا، اسے ہم شاہ ولی اللہ کا نظریہ انقلاب کہتے ہیں۔

اب ہم شاہ صاحب کی کتابوں سے ان کے ان افکار کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ دوم میں ارشاد ہوتا ہے۔

''معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو ان کی معاش و روزی بھی زمین پر مقرر کی۔ زمین کی اشیاء سے انتفاع ان کیلئے مباح اور جائز گردانا۔ اور چونکہ حرص و آز کی وجہ سے ان کے نزاعات و جھگڑے ہونے لگے تو حکم الٰہی یہ قرار پایا کہ کوئی انسان دوسرے انسان کی مخصوص و مختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے.....

''نیز چونکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور بلا باہمی تعاون کے انسان کی معاشی و معاشرتی تعمیر کی استقامت ناممکن ہے، اس لیے قضائے الٰہی سے انسانوں کے لئے باہمی تعاون واجب اور لازم کر دیا۔ نیز چونکہ نوع انسانی کا کوئی فرد بلا کسی سخت مجبوری کے تمدنی و عمرانی اور تمدنیات و عمرانیات کے دخل و اثر سے علیحدہ بے تعلق اور بے اثر نہیں رہ سکتا اور اس کا اصل اور حقیقی سبب اور وجہ یہی ہے کہ ہر انسان کے لیے اپنے مباح مال کا تحفظ ناگزیر ہے۔ نیز اس مال مباح کا جو ہر انسان کیلئے مخصوص اور مختص ہو چکا ہے جس کے ذریعہ ہر انسان اپنی امداد و استعانت کرتا ہے۔ نمو اور اضافہ بھی ضروری ہے۔۔۔۔۔''

اب اس مال میں نمو اور اضافہ شاہ صاحب کے الفاظ میں ''بلا باہمی تعاون معاشی کے متعذر اور محال ہے۔ اور اس تعاون کے کچھ ایسے طریقے ہیں کہ جن کے بغیر شہری زندگی کی استقامت متغیر اور دشوار ہو جاتی ہے۔۔۔'' اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ ''میں کہتا ہوں، اس کی حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا مال اور ملکیت ہے۔۔۔ اور کسی انسان کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز سے انتفاع کا حق سب سے زیادہ اس کو ہے، دوسرے کو نہیں۔۔۔''

پھر فرماتے ہیں۔۔۔ ''میں کہتا ہوں۔ اصل اس بارے میں یہ ہے کہ جس مباح چیز میں بہت سے لوگوں کے حقوق علی الترتیب لازم ہوں، تو ایسی صورت میں واجب یہی ہے کہ ترتیب کی اسی قدر رعایت کی جائے کہ جس سے سب کو فائدہ پہنچے اور یہ فائدہ ایسا ہو جو کم سے کم سمجھا جائے۔۔۔ اس ضمن میں ایک حدیث بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے۔۔۔

''آنحضرت صلعم نے ابیض بن حمال المآربی کو نمک کا ایک چشمہ دار قطعہ عطا کر دیا تھا کسی نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! آپؐ نے اس کو نہ ٹوٹنے والا، نہ ختم ہونے والا مادہ دے دیا۔ راوی کہتا ہے یہ سن کر آں حضرت صلعم نے وہ قطعہ ان سے واپس لے لیا۔۔۔ میں کہتا ہوں اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں کہ جن معادن اور کانوں میں زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت نہ ہو۔ ایسی معادن اور کانیں کسی ایک مسلمان کو دے دینا عام مسلمانوں کے حق میں مضرت رساں ہے۔ اور ان کے حق میں ایک قسم کی ضیق اور تنگی ہے۔ پس آنحضرت صلعم نے اس قطعۂ نمک کو ابیض بن حمال مآربی سے واپس لے لیا''۔

اس تمہید کے بعد حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

کسی شہر کے اندر مثلاً دس ہزار آدمی اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس وقت اس شہر کی مدنی شہری سیاست اور شہر کے باشندوں کے کسب اور پیشوں سے بحث ناگزیر ہوگی۔ وہ پیشے جن

سے شہر کی معیشت متوازن نہ رہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک فساد اور خرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس صورت میں عطیۂ حکمتِ الٰہی کے مطابق معروف و مستحسن طریقوں پر معروف و مستحسن کسب اور پیشے ان کیلئے لازم کر دیے جائیں اور رذیل و خسیس پیشوں سے ان کو روک دیا جائے تو شہری باشندوں کی حالت یقیناً درست ہو جائے گی۔

معاش کا یہ فساد شاہ صاحب کے نزدیک ''شہر و ملک کیلئے ایسا متعدی ضرر رساں مرض اور روگ ہے کہ شہر اور ملک کے تمام گوشوں میں پھیل جائے گا اور اس طرح عام ہو جائے گا کہ تمام باشندوں کو اپنی زد میں لے لیگا۔ اور یہ مرض اور اس کا زہر شہر و ملک میں اس طرح جاری و ساری اور پیوست ہو جائے گا۔ جس طرح کسی کو کتا کاٹ لیتا ہے۔ اور اس کے سارے جسم میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اور یہی وہ مہلک و خطرناک مرض تھا۔ جو عجمی ممالک میں بلائے بے درماں کی طرح تمام پر مسلط ہو چکا تھا۔ چنانچہ خدائے قدوس نے اپنے پیغمبر صلعم کو القاء فرمایا کہ اس مرض مہلک کا علاج کریں اور مرض کے اصل مادہ کا قلع قمع کر دیں۔۔۔ (صفحہ ۲۸۲۔۲۹۰)

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشرے کے ان مفاسد کا ازالہ بھی تھا، جو معیشت کے خراب طریقوں کی وجہ سے پیدا ہو چکے تھے۔

خود شاہ صاحب کے زمانے میں معاشرے میں اسی قسم کے جو مفاسد پیدا ہو چکے تھے۔ آپ نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

''اس زمانے میں شہروں کی بربادی کے دو بڑے اسباب ہیں' ایک یہ کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ چونکہ وہ فوجی یا عہدے دار ہیں۔ اس لیے بیت المال پر ان کا حق ہے اور اس طرح ان کا کسب معاش کا ذریعہ صرف بیت المال بن کر رہ گیا ہے۔ یا زہاد اور شعراء وغیرہ ہیں جن کو بادشاہوں کے صلہ کی عادت پڑ گئی ہے اور اپنی معاش کا ذریعہ صرف بیت المال ہی کو سمجھ بیٹھے ہیں اور بغیر کسی خدمت کے بیت المال پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے ہاں جاتے

ہیں اوران میں کبیدہ خاطری پیدا کرتے ہیں اور شہری آبادی پر بارگراں بن کر رہ جاتے ہیں۔

''دوسرا سبب یہ ہے کہ کسانوں، تاجروں، پیشہ وروں اور دست کاروں پر گراں بار ٹیکس لگائے جارہے ہیں اوران پر حد سے زیادہ سختی کی جاتی ہے جس سے اطاعت گزاروں پر مصیبت آتی ہے، اور برباد ہو جاتے ہیں، اور وہ لوگ جو جری ہوتے ہیں وہ حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ شہروں کی بہبود کا طریقہ یہی ہے کہ رعایا پر کم سے کم ٹیکس لگائے جائیں اور ضرورت کے مطابق محافظ ونگراں مقرر کیے جائیں۔ اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیے۔ (واللہ اعلم ص ۱۲۲۔ حصہ اول)

شاہ صاحب کا یہ فرمانا۔ ولیتنبه اهل الزمان بهذه النكة (اہل زمانہ کو اس اہم نکتہ سے آگاہ ہونا چاہیے۔) اپنے دور کے ارباب حکم کے لیے ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی دعوت امور دین کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی جملہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی خرابیوں کی اصلاح پر بھی مشتمل تھی۔

رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بدولت قیصر وکسری کی سلطنتوں کے ختم ہونے کے کیا معنی تھے؟۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول میں اسے یوں بیان کیا ہے۔

''آنحضرت صلعم کے عہد سعید میں وہ اقالیم صالحہ اور ممالک متمدنہ کہ جن میں معتدل مزاج کی تولید و پیداوار ہوا کرتی تھی۔ وہ دنیا کے دو بڑے زبردست بادشاہوں کے ماتحت تھے۔ ایک کسریٰ کے عراق، یمن، خراسان اوران کے متصل کے تمام ممالک پر اس کا تسلط واقتدار قائم تھا اور ماوراء النہر ہندوستان کے تمام بادشاہ راجہ اس کے محکوم و باجگزار تھے۔ اور ہر سال انہیں کسریٰ کو ایک مقررہ خراج ادا کرنا پڑتا تھا۔

''دوسرا قیصر تھا۔ شام، روم، اور اس کے نواح کے تمام ممالک پر اس کا تسلط واقتدار قائم تھا اور مصر، مغرب اور افریقہ وغیرہ کے تمام سلاطین اس کے زیر فرمان اور باج گزار

تھے۔ان دو زبردست شہنشاہوں کی دولت وطاقت کوتوڑ دینا اوران کے ملک پرتسلط واقتدار قائم کرلینا ایسا تھا گویا تمام روئے زمین پرتسلط واقتدار قائم کرلیا گیا۔ان سلاطین کی غیر معتدل مرفہ الحالی اورمفرطانہ عیش پرستی کے جراثیم اور مہلک عادات واطوار کی گندگیاں ان تمام ممالک میں سرایت کرچکی تھیں۔ جوان کے تسلط واقتدار کے زیرفرمان تھے۔اورتمام باشندے ان کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔اس لیے انکی عادات واطوار اور رسوم ورواجات کوتبدیل کردینا اوران کوان خطرناک مہلک جراثیم سے پاک صاف کردینا گویا دنیا کے تمام ممالک کی اصلاح و درستگی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالی نے جب یہ ارادہ کیا کہ ملت ودین کی کجی کودور کیا جائے اورایک ایسی امت اورقوم تیار کی جائے، جوامر بالمعروف اورنہی عن المنکر کا فرض پوری قوت سے انجام دے اورلوگوں کی فاسد رسوم کویکسر تبدیل کردے۔تو یہ امر اس بات پرموقوف تھا کہ ان ہر دو بڑی سلطنتوں کودنیا سے نیست ونابود کردیا جاتا اوراس مقصد کوسہولت وآسانی سے حاصل کرنے کیلئے ضروری تھا کہ ان ہردو جابر سلطنتوں سے تعرض کیا جاتا۔ کیونکہ انہی دوسلطنتوں کے حالات تمام متمدن اورصالح ممالک میں سرایت کیے ہوئے تھے۔یاسرایت کرتے چلے جاتے تھے۔پس اللہ تعالی نے ان ہردو سلطنتوں کے زوال اورقلع قمع کا فیصلہ کیااورخود آنحضرت صلعم نے اس کی خبردی کہ ھلک کسریٰ ولا کسری بعدہ وھلک قیصر ولا قیصر بعدہ (کسری ہلاک ہوااس کے بعدکوئی کسری نہیں ہوگا اورقیصر ہلاک ہوگیا۔اس کے بعدکوئی قیصر نہیں ہوگا)۔ اورحق اس طور پر نازل ہوا کہ روئے زمین سے باطل کی جڑیں اس طریقہ سے اُکھاڑ دی گئیں۔ آنحضرت صلعم اورآپ کے صحابہ کے ذریعہ عرب سے باطل کا قلع قمع کردیا گیا۔اورپھرعرب کے ذریعہ ان ہردو جابر سلطنتوں کا قلع قمع کردیا گیا اورپھران کے ذریعہ تمام عالم کی باطل طاقتیں توڑدی گئیں اوردنیا سے باطل ناروا اُمور کا خاتمہ کردیا گیا اوردنیا کو پاک وصاف کردیا گیا۔وللہ

الحجۃ البالغہ۔۔۔"

ایک اور جگہ شاہ صاحب سلاطین عجم وروم کی بداعمالیوں کا مقابلہ اپنے دور کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں سے یوں کرتے ہیں، لکھتے ہیں۔

"معلوم ہونا چاہیے کہ سلاطین عجم وروم قرن ہا قرن سے سلطنتوں کے وارث چلے آرہے تھے۔اس لیے یہ لوگ سرتاپا دنیوی لذتوں اور عیش کوشیوں کے عادی ہو چکے تھے۔آخرت کو بالکل فراموش کر چکے تھے۔شیطان ان پر پوری طرح غالب ہو چکا تھا۔اور انہی امور کو انہوں نے مقصد حیات سمجھ لیا تھا۔شدہ شدہ یہ حالت ہوگئی کہ وہ امیر، رئیس یا سردار جس کی کمر کی پیٹی اور تاج کی قیمت ایک لاکھ درہم سے کم ہوتی اس پر طعن وتشنیع کیا کرتے، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس عالی شان محل، شاندار قصر وایوان، حوض، حمام، باغات خوبصورت قیمتی چوپائے، گھوڑے، حسین غلام وخدام اور لونڈیاں نہ ہوتیں۔۔۔اس پر طعن وتشنیع کیا کرتے۔اس قسم کے امور کا ذکر بہت طویل ہے۔اور ان کی داستانوں کے دہرانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔اپنے ملک کے بادشاہوں، رئیسوں اور امیروں کا حال ہی دیکھ لو۔

"غرض اس قسم کے مہلک اور خطرناک امور ان لوگوں کی معاشرت کے اصول اور جزو زندگی بن گئے تھے اور ایسی خطرناک شکل اختیار کر لی تھی کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے کر دیے جاتے۔تب بھی ان کے دلوں سے ان کا نکلنا دشوار تھا۔شہر وملک کے تمام اطراف وجوانب میں یہ لاعلاج امراض اس طرح پھیل گئے تھے کہ لوگ ایک عام مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔۔۔۔۔تمام کے دامن اس سے الجھ گئے تھے اور تمام کو عاجز ومغلوب کر کے رکھ دیا تھا۔۔۔۔۔

(آخر میں) "جب دنیا میں یہ عظیم ترین مصیبت عام ہوگئی اور یہ مہلک وخطرناک مرض نہایت سخت ہو گیا۔روم وعجم کے تمدن غیر صالحہ نے دنیا کی کمر توڑ دی تو ان پر اللہ تعالے اور اس کے ملائکہ مقربین کی ناراضگی ظاہر ہوئی۔اس وقت اللہ تعالی کی خوشنودی اسی میں تھی کہ اس مہلک

مرض کا علاج کیا جائے۔ اللہ تعالی نے فیصلہ کر دیا کہ پیغمبر صلعم کی سلطنت قائم کر کے عجمیوں کی سلطنت ختم کر دی جائے اور یہ شکل اسی طرح وقوع پذیر ہوئی کہ **هلک کسری و لا کسری بعده و هلک قیصر و لا قیصر بعده۔**

شاہ صاحب نے ''البدور البازغہ'' میں معاشی فراغت (ترفہ) میں ایک حد اعتدال قائم کرنے کی تلقین کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس کے بارے میں دو متعارض قیاس ہیں۔ ایک یہ کہ معاشی فراغت اچھی چیز ہے طبیعت اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سے مزاج، دماغ اور دل صحیح رہتا ہے۔ اخلاق اور علوم اس کی وجہ سے استقامت اختیار کرتے ہیں اور یہ کہ تمام کند ذہنی اور بد خلقی برے کھانے اور دوسری بری تدابیر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نیز ذہانت، نیک خلقی اور لطف و مروت صحت مند تدبیروں کا حاصل ہے۔ اس ضمن میں دوسرا قیاس یہ ہے کہ معاشی فراغت بری ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے ہوتے ہیں اور انسان دوڑ دھوپ میں پڑ کر آخرت سے منہ موڑ لیتا ہے۔ (البدور البازغہ ص ۵۵۔۵۶)

شاہ صاحب ان دونوں پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ معاشی فراغت یعنی رفاہیت میں حد اعتدال ہی اچھی چیز ہے۔ جس سے کہ انسان جملہ خوبیوں کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خرابیوں سے بچا رہے۔ رفاہیت میں افراط و تفریط دراصل معاشی ناہمواری سے پیدا ہوتی ہے اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

آج کل کے سیاسی نظاموں میں اہل علم صرف ایک امیر کی اطاعت کو مرکزیت کیلئے ضروری نہیں سمجھتے انکے نزدیک اس سے خرابیاں پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہیں۔ شاہ صاحب اس کا علاج یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک بورڈ ہو جس کے ارکان کے ہاتھ میں الگ الگ اختیارات ہوں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں میں نے کسی مذہبی عالم کے ہاں اس طرح کا فکر نہیں پایا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک کامل ریاست میں جس میں بہت سے افراد ہوتے ہیں۔ نظام قائم

رکھنے کے لیے ایک ایسا آدمی ہونا چاہیے جو اکیلا سب امور کی کفالت کرے اور وہ ''الامام الحق'' ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے۔ وقلما یوجد ذلک اور ایسا آدمی کم ہی ملتا ہے۔ چنانچہ اکثر دو تین امور ایک آدمی کی تحویل میں ہوتے ہیں اور باقی امور دوسرے کے پاس۔ (البدور البازغہ۔۷۲)۔

شخصی حکومت کی بجائے عقلائے قوم کی حکومت کی یہ تجویز پارلیمنٹری نظام کا نقطۂ آغاز ہوسکتی تھی۔ کاش اسوقت اس کی طرف توجہ کی جاتی۔

''اقترابات'' جن سے مراد قرب الٰہی کے حصول کے ذرائع اور ارتفاقات جو عبارت ہیں معاشی، سیاسی و اجتماعی تدابیر سے شاہ صاحب کے نزدیک اسلام ان دونوں کے لیے صراط مستقیم پیش کرتا ہے اس نے قیصریت و کسرویت کو ختم کر کے ارتفاقات میں راہ وسط پیدا کی اور ہر قسم کے شرک کی تردید کر کے اقترابات کا صحیح مقام معین کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت آفریں طبیعت کا یہ خاص کمال ہے کہ انہوں نے اس دور میں اسلام کی اس ہمہ گیر روح کو بے نقاب کیا۔ ایک تو انہوں نے روحانی زندگی و مادی زندگی (اقترابات اور ارتفاقات) کے ایک وحدت ہونے کا اثبات کیا اور بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد معاشی ناہمواریوں کا خاتمہ کرنا بھی تھا۔ دوسرے انہوں نے تمام مذاہب کے مشترک مبادی معین کیے اور اس طرح مسلمانوں کے سامنے از سر نو وہ تمام ذہنی وسعتیں بے نقاب کیں۔ جو صدیوں سے ان کی نظروں سے اوجھل تھیں۔

یہ اساسی نظریہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی اس دعوت کا جسے میں ان کی ''دعوت انقلاب'' کا نام دیتا ہوں۔

(یہ مضمون مدیر الرحیم نے حضرت سندھیؒ کی امالی سے مرتب کیا۔ اپریل ۱۹۶۴ء)

''وفاق'' کے مدارس کا کردار

(حضرت نانوتویؒ کے اصول کی روشنی میں جائزہ)

دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی دینی فراست اور علمی ذکاوت کا عملی نمونہ تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد جب مسلمانوں سمیت باشندگان ہند کا قتل عام کیا گیا اور ان کے مذہبی اعتقادات کو جبراً تبدیل کر کے انہیں عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا جانے لگا تو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایک ایسے دینی مرکز کی نیو اٹھائی جس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی اقدار کی حفاظت اور وقت کی جابر سلطنت یعنی حکومت انگلشیہ کے خلاف ایسی جماعت تیار کرنا تھا جو مسلمانوں کے عادلانہ نظام اور ان کی عظمت رفتہ کی یاد تازہ کردے۔

مولانا نانوتویؒ کے قائم کردہ دارالعلوم دیوبند کی نسبت سے جو دیوبندی کہلاتے ہیں، ان میں سے اکثر یہ نہیں جانتے کہ دیوبند کسی عمارت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مستقل نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے ایک ایسا نظریہ جو آنحضرت ﷺ کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر ایک آزاد اور عادلانہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ اکابرین کی جدوجہد آزادی اور وقت کی ظالمانہ اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف قربانیاں اس نظریہ کی زندہ مثالیں ہیں۔

بدقسمتی سے پاکستانی وفاق المدارس کے مدارس میں تاریخ دیوبند اور مقاصد دیوبند کے حوالے سے حقیقی آگاہی نہیں دی جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مدارس اس نظریاتی دیوبند سے دور ہوتے جارہے ہیں جس کی بنیاد مولانا نانوتویؒ نے رکھی تھی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کے جو آٹھ اصول وضوابط وضع کئے تھے وہ ''اصول ہشتگانہ'' کے نام سے موسوم ہیں۔

مولانا نانوتویؒ کے پہلے اصول کی پہلی شق کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

''آزادیِ ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلاء ہو۔ کوئی سنہری طمع، مربیانہ دباؤ یا سرپرستانہ مراعات اس میں حائل نہ ہو سکے۔''(۱)

لیکن آج بدقسمتی سے محض چند مدارس کو چھوڑ کر مدارس کی اکثریت مولانا کے اس اصول پر پورا نہیں اترتی۔ ان مدارس میں آہستہ آہستہ آزادیِ ضمیر کے ساتھ وقت کی جابر طاقتوں کے خلاف اعلاء کلمۃ الحق کی اہلیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند اس لئے قائم ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کو ہونے والے عظیم نقصان کا ازالہ کیا جاسکے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانانِ ہند ہندوستان میں جس کسمپرسی کی حالت میں زندگیاں گزار رہے تھے اور عیسائی مشنریاں جس دیدہ دلیری سے شعائر اسلام کا مذاق اڑانے اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سرگرم تھیں، اس کا تقاضہ تھا کہ ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے، جہاں مسلمانوں کی دینی، سیاسی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ وقت کی جابر طاقت یعنی حکومتِ برطانیہ سے آزادی کے حصول کیلئے ایسے رجال تیار کئے جائیں جو انہیں اس شکست کا مزا چکھادیں۔

چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (جو کہ اس مدرسہ کے سب سے پہلے طالب علم تھے) کی زندگی اس کی زندہ مثال ہے حضرت شیخ الہندؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

''حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''(۲)

حضرت نے مزید فرمایا:

''تعلیم وتعلم، درس وتدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا میں نے انتخاب کیا ہے، جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت

الاستاذ نے قائم کیا تھا۔" (۳)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ دارالعلوم کے قیام کے پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جس وقت شاملی کے میدان سے وہ خود (مولانا نانوتویؒ) اور ان کے رفقائے کار بہ ظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس و نامرادی کی واپسی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ واپس تو وہ بے شک ہوئے تھے لیکن یقیناً یہ واپسی مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ (الانفال) "جنگ ہی کے لئے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لئے" ہو سکتی تھی اور یقیناً اسی کے لئے تھی۔ (۴)

آگے چل کر دارالعلوم کے قیام کو "قتال کے نئے محاذ اور میدان کی تیاری" سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتویؒ) کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی و جوہری عنصر تھا۔" (۵)

گویا دارالعلوم کے قیام کا مقصد صرف درس و تدریس نہیں تھا، بلکہ ایک ایسا مرکز قائم کرنا مقصود تھا جہاں مسلمانوں کی بچی کھچی انفرادی صلاحیتوں کو اجتماعی شکل دیدی جائے، اور یہ اجتماعی طاقت اس مقصد کا احیاء کرے اور اس کام کو مکمل کرے، جو حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ کے ہاتھوں انجام نہ پا سکا۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور خود مولانا نانوتویؒ کی زندگیاں اور کردار اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کا طویل حصہ انگریز حکومت کے خلاف جہاد میں گزرا۔

نیز حضرت نانوتویؒ کا وضع کردہ پہلا اصول ہی ایسا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کسی بھی سنہری طمع، سرپرستانہ مراعات اور مربیانہ دباؤ میں آئے بغیر آزادی ضمیر کے ساتھ حق گوئی سے باز نہیں آنا۔ لہٰذا یہ اصول ہمیں یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ ایک ایسے غلام ملک میں جہاں مذہب،

حکومت اور آزادی رائے پر طاغوتی اور جابر وقت کا تسلط ہو۔ یہ اصول بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ ایک انقلابی دعوت نہیں ہے۔

بنیادی طور پر اس سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی جبکہ حق گوئی بذات خود ایک جرم کا درجہ رکھتی تھی، اور اس کی پاداش میں موت سے ہمکنار ہونا ایک معمول تھا، اور مسلمانوں کی بچی کھچی اجتماعی قوت کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا، مسلمانوں میں آزادیِ ضمیر اور آزادیِ رائے کو زندہ رکھنے والے موجود تھے۔

اب آیئے اصل مسئلہ کی طرف، آج ملک بھر میں ہزاروں وفاق المدارس سے منسلک مدارس درس وتدریس میں مشغول ہیں، اور ان سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کی تعداد ہزاروں میں ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آج یہ ''دیوبندی'' کہلوانے والے مدارس نظریہ دیوبند سے بہت دور ہو چکے ہیں اور اس کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

1)۔ آج ملک بھر میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں، جو آزادیِ ضمیر اور حریت رائے کے ساتھ مربیانہ دباؤ اور سرپرستانہ مراعات میں آئے بغیر عصرِ حاضر کی جابر طاقتوں کے خلاف کوئی ٹھوس اور واضح لائحہ عمل یا انقلابی پروگرام رکھتا ہو۔ چنانچہ آج اگر کوئی حق گو ''اعلاء کلمۃ الحق'' کرتا بھی ہے تو اس کی اس انفرادی صدا کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

2)۔ آج ان مدارس کے احباب مسند نشین کی حق گوئی محض اخباری بیانات اور جذباتی تقریروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

3)۔ آج ان مدارس کی اکثریت مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے پر مصر ہے، چنانچہ ان کے اس رویہ نے اسلامی معاشرے میں دین ودنیا کی تفریق کے تصور کو مزید مستحکم کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم معاشرہ سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔

4)۔ ہمارے مدارس کے وہ لوگ جو سیاست کو دین سے الگ تصور نہیں کرتے اور اسلامی سیاست کی دعوت دیتے ہیں، آج ملک کے سیکولر اور لادینی نظام کا حصہ بن چکے ہیں، اور بزعم خویش اسی پر مطمئن ہیں کہ نظام کا حصہ بن کر نظام کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو ''کچھ دو کچھ لو'' کا نعرہ لگایا جاتا ہے اور دوسری طرف اسلامی شریعت کے نفاذ کی بات کی جاتی

ہے۔اس دوعملی نے نا صرف آزادیِ ضمیر کو متاثر کیا ہے بلکہ عوام بھی مدارس کی پروردہ مذہبی و دینی جماعتوں سے مایوس ہوتے جارہے ہیں۔

5)۔دین کے فروعی مسائل پر بحث شروع دن سے رہی ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی مسلمانوں نے اسی کو دینی شعار اور ذاتی وقار کا ذریعہ سمجھا، ان کی اجتماعی طاقت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا۔لیکن آج یہ دینی مدارس دین کے ایک محاذ کو محاذ کل سمجھے ہوئے ہیں۔چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم معمولی اختلافات کا شکار ہوکر فرقہ در فرقہ بٹتے چلے جارہے ہیں، اور یہ فرقہ بندی مسلکِ دیوبند سے باہر کی نہیں بلکہ آج دیوبندی کہلوانے والی بیسیوں جماعتیں ہمارے اِردگرد موجود ہیں۔چنانچہ نظریہ دیوبند انہی جماعتوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوکر رہ گیا ہے۔

مولانا نانوتویؒ کے گزشتہ ذکر کیے گئے پہلے اصول کی دوسری شق کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اس کا (دیوبند) کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ زائد سے زائد ہو۔تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کردے جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو، اور اس طرح اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لئے ورنہ کم از کم اس وقت تک کے لئے محفوظ ہوجائے۔جب تک کہ یہ مرکز اپنے صحیح اصول پر قائم رہے، نیز توکل علی اللہ اور عوام کی طرف سے احتیاج خود کارکنانِ مدرسہ کو اسلامی شان پر باقی رکھ سکے اور جابرانہ استبداد یا ریاست کا ٹھاٹھ ان میں قطعاً نہ پیدا ہو، بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے، اور اس طرح آپس میں خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔''(۶)

بدقسمتی سے موجودہ مدارس مولانا نانوتویؒ کے اس اصول پر بھی پورا نہیں اترتے۔دیوبند کا مقصد تو یہ تھا کہ عوام الناس سے زیادہ سے زیادہ تعلق پیدا ہو اور اس کا سیاق وسباق یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں انقلابی سوچ کی حامل ایک قیادت صفحۂ ہستی سے مٹائی جاچکی تھی اور مسلمان اجتماعیت ہر جگہ انگریزوں کے شکوک وشبہات اور ظلم وستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ان حالات میں مسلمانوں میں دو طرح کی سوچ پائی جاتی تھی۔

1)۔ یہ وہ لوگ تھے جو انگریزوں کے ظلم و بربریت کے خلاف تو تھے لیکن مضبوط مرکز اور عملی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ اس مکتب فکر کے لوگ انگریز سے مرعوب ہونے کی بجائے اپنے اصولوں پر ثابت قدمی سے قائم رہے اور اسلامی تہذیب اور اس کے الگ تشخص کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔

2)۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو انگریز حکومت کی طاقت وسطوت سے مرعوب ہو گیا۔ اس مکتب فکر کے لوگ یہ سوچ رکھے تھے کہ انگریزوں سے آزادی بزور شمشیر حاصل کرنے کی بجائے خود کو ان کا بہتر جانشین ثابت کر کے لی جاسکتی ہے۔

چنانچہ اس مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت نے اپنی وضع قطع اور رہن سہن کو بہت حد تک انگریزوں کے رنگ میں ڈھال لیا۔

پہلی قسم کی سوچ نے دیوبند کی شکل اختیار کی اور دوسری قسم کی سوچ علی گڑھ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ سرسید احمد خانؒ نے آزادی کے حصول کے لئے جو راہ اپنائی وہ انگریز سامراج کی تہذیب و ثقافت سے ہو کر گزری تھی۔ یعنی ان کا خیال یہ تھا کہ انگریزوں کا انخلا محض اس صورت میں ممکن ہے کہ خود کو ان کا علمی وسیاسی جانشین ثابت کیا جائے۔ ظاہر ہے اس صورت میں شاید وطنی آزادی تو حاصل ہو جاتی لیکن ذہنی وثقافتی غلامی کی شکل میں ایک بھاری قیمت چکانی پڑتی، جیسا کہ ہوا اس کے برعکس مولانا نانوتویؒ نے آزادی کی جو راہ چنی وہ سراسر دینی تھی، اور اس کے پیش نظر ابتدائی طور پر مسلمانوں کی زندگیوں کو اسلامی اقدار میں ڈھالنا تھا، اور ان کو مرعوبیت سے بچانا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ مولانا نانوتویؒ جدید علوم کے شاید مخالف تھے۔ بلکہ وہ ان علوم کا حصول طلباءِ مدارس کے لئے ضروری خیال فرماتے تھے۔ چنانچہ سید محبوب رضوی مرحوم نے مولانا نانوتویؒ کی یہ تحریر نقل کیا ہے۔

> ''اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ہوگی۔'' (۷)

ان دونوں مکاتب فکر کے مخلص افراد کا مقصد آزادی تھا لیکن حصول مقصد کے طریقے میں اختلاف تھا، اور یہ اختلاف وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر شدید ہوا کہ انگریزوں کے خلاف دو الگ

محاذ جنگ قائم کرنے کی بجائے مسلمان خود آپس میں محاذ آراء ہو گئے، اور یہ فکری محاذ آرائی اب تک قائم ہے۔ حالانکہ ان دونوں فکری تحریکوں کا ملاپ ہی انقلاب کا صحیح راستہ متعین کرنے میں معاون و مددگار ہو سکتا ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کمی کو شدت سے نا صرف محسوس کیا بلکہ ان دونوں تحریکات کے اشتراک کے نتیجے میں ایک قومی انقلاب برپا کرنے کے لئے عملی اقدامات اٹھائے۔ اپنی زندگی کے انتہائی ایام میں "جامعہ ملیہ" کے افتتاح کے موقع پر حضرت نے فرمایا:

> "اے نونہالانِ وطن جب نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔ تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا، اور جس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا، کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں۔ لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں لیکن اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔" (۸)

حضرت شیخ الہند نے مزید فرمایا:

> "آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں! یہ بے شک کہا گیا کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں..... تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کا جاہل رہنا ہی اچھا ہے از راہ نوازش آپ ہی انصاف کیجئے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثر بد سے۔" (۹)

یہ حضرت شیخ الہندؒ ہی تھے جنہوں نے مدارس اور کالجوں کی اس فکری خلیج کو ختم کرنے کے لئے

"نظارۃ المعارف" کی بنیاد رکھی اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو اس کا ناظم بنایا۔ جنہوں نے بڑی مستعدی اور حکمت عملی سے اپنا کام سرانجام دیا۔ مگر چند دوست نما دشمنوں کی ریشہ دوانیوں نے اسے پنپنے کا موقع نہ دیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ہی علی گڑھ کے فاضل اور شہر آفاق مقرر مولانا محمد علی جوہر مرحوم کو دیوبند آنے کی دعوت دی اور باوجود اس کے کہ وہ کوئی عالم دین یا فقیہ نہیں تھے، اپنی دستار ان کے سر پر رکھ دی۔ حضرت کے اس عمل سے دو نتائج برآمد ہوئے۔ اول مولانا کی وسیع القلبی اور اخلاق و محبت کے اس عظیم مظاہرہ سے بہت سے علیگ یا غیر درسی حضرات تحریک دیوبند کے حوالے سے اپنے نکتہ نظر پر نظر ثانی کے لئے آمادہ نظر آنے لگے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کا وسیع حلقہ ایسے حضرات کا تھا جو مذہبی معاملات میں محض نمود و نمائش کا قائل نہیں تھا۔ نیز حضرت کی انہی پالیسیوں کی بدولت (جو کہ دراصل حضرت نانوتویؒ ہی کے پہلے اصول کی دوسری شق کا احیاء تھا) ماسوائے انگریز حکومت اور اس کے گماشتوں کے کوئی دوسرا دشمن نہ رہا۔

دوسرا نتیجہ مولانا کے اس عمل کا یہ ہوا کہ ارباب دیوبند کا ایک مخصوص ذی اقتدار طبقہ ان کا مخالف ہو گیا اور ان کی راہ میں مزاحم ہو گیا۔ چونکہ مولانا کی ذاتی علمی وجاہت اور مقام و مرتبہ کی وجہ سے کسی کو یہ جرأت تو نہ ہوئی کہ وہ علی الاعلان ان کی مخالفت کرتا لیکن شیخ الہندؒ کی پالیسیوں کو ناکام بنانے اور ان کی طاقت ختم کرنے کے لئے ان کے قریبی ساتھیوں کو ان سے الگ کر کے اور دارالعلوم بدر کر کے حضرت کی طاقت اور زور بازو کو کمزور کر دیا گیا۔ اس حلقہ نے ایسا کیوں کیا؟ شاید یہ حلقہ دارالعلوم کی عمارت اور طریقہ تعلیم کو اس نقصان سے بچانا چاہتا تھا جو اُن کے خیال میں حضرت شیخ الہندؒ کی پالیسیوں کے نتیجے میں مدرسہ کو لاحق تھے۔

حالانکہ مولانا نانوتویؒ نے دارالعلوم محض تعلیم و تعلم کے لئے قائم نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کا مقصد جہاد شاملی اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وقتی ناکامی کا بدلہ لینا تھا۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ ہی کا ارشاد:

> "ہم نے دارالعلوم کے اصل مقصد پر درس و تدریس، علوم اسلامی کا پردہ ڈال دیا ہے۔" (۱۰)

یہ ثابت کرتا ہے کہ دارالعلوم کا مقصد محض تعلیم و تعلم نہ تھا۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ کے علمی و عملی جانشین حضرت شیخ الہندؒ نے بھی ایک سوال کے جواب میں یہی ارشاد فرمایا تھا:

''حضرت الاستاذ (مولانا نانوتویؒ) نے کیا اس مدرسہ کو درس وتدریس، تعلیم وتعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''(۱۱)

1)۔ چنانچہ حضرت (نانوتویؒ) نے احاطہ مدرسہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھانے کا بندوبست بھی فرمایا کہ علم کے ساتھ سپاہیانہ اسپرٹ بھی ان میں قائم رہے۔

2)۔ محکمہ قضاء بھی ان میں قائم فرمایا تاکہ تنفیذ احکام شرعیہ کی خو بھی ان میں محفوظ رہے۔

3)۔ ترکوں کی امداد کے لئے بھی مساعی فرمائیں۔

4)۔ سلطان ترکی کی مدح میں قصائد بھی لکھے۔ تاکہ خلافت اسلامیہ سے مدرسے کے نونہالوں کا ربط قائم رہے۔

5)۔ انگریزی تسلط کے بعد ایسی اجتماعی انجمنوں کی حمایت وتائید بھی کی جو انگریزوں سے ملکی حقوق حاصل کرنے کے لئے قائم کی گئیں۔(۱۲)

افسوس یہ ہے کہ آج اکثر مدارس حضرت نانوتویؒ کے پہلے اصول کی دوسری شق پر بھی پورا نہیں اترتے، اور ان کی فکر سے کٹتے جارہے ہیں۔ حضرت کا فرمانا تو یہ تھا کہ عام مسلمانوں سے زیادہ تعلق ہو۔ لیکن آج کے مدارس عام مسلمانوں سے اتنے ہی دور ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دوریاں ختم ہوتیں مگر یہ جوں کی توں قائم ہیں۔ بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جارہا ہے یہاں عام مسلمانوں سے ظاہر ہے وہ حضرات مراد لئے گئے ہیں جو موروثی مسلمان ہیں اور دین اسلام سے ان کا تعلق اور معلومات کچھ زیادہ نہیں۔

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے اس شق کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مساعی کیں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا تاکہ وہ اس اجتماعی نظام کا حصہ بن سکیں اور خود کو الگ جنس تصور نہ کریں۔ لیکن بدقسمتی سے حضرت کے اصول سے انحراف ان کی موت کے کچھ ہی عرصے بعد شروع ہوگیا تھا۔ ''مولوی'' اور ''بابو'' کی اصطلاحات نے اسے مزید ہوا دی، اور آج یہ حال ہے کہ

ہمارے ارباب مدارس کالج اور یونیورسٹی کے نیم مذہبی طلباء کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔ نیز اسلام اور عصری تقاضوں سے متعلق ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کی بجائے اپنے اخلاقی، سماجی اور معاشرتی رویوں سے انہیں مزید دور کرتے جارہے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے کہ آج ہمارے کالج اور یونیورسٹیوں کے قابل قدر اور مستقبل کے سیاسی ومعاشرتی معمار اپنی لگامیں لادینی قوتوں کے سپرد کر چکے ہیں، اور یہ سب حضرتؒ کے اصول سے انحراف کا نتیجہ ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے اس زریں اصول میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ پر توکل اور عوام کی طرف سے احتیاج کی وجہ سے مدرسہ کے کارکنوں میں جابرانہ استبداد اور ریاست کا ٹھاٹھ پیدا نہ ہوگا۔ لیکن آج اکثر مفتیان کرام اور علماء عظام سے ملنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ وزیر اعلیٰ سے۔ علماء حق اور صوفیاء کا شیوہ تو یہ تھا کہ وہ امراء سے کتراتے اور غرباء کے پاس خود چل کر جاتے تھے۔ اسی وجہ سے ایک بوسیدہ جھونپڑی میں بیٹھے حق گو عالم وصوفی کی حق گوئی سے قصرِ خلافت کانپتا تھا۔ لیکن آج کی صورتحال اس کے برعکس ہے۔

حضرت کا یہ فرمانا بھی قابل توجہ ہے کہ اس طرح کا ٹھاٹھ اور جابرانہ تعلق پیدا نہ ہو بلکہ ایک جمہوری تعلق ہو جو فریقین کو ایک دوسرے کا محتاج بنا کر رکھے، اور اس طرح خود ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہے۔ لیکن آج یہ احتیاج اور اصلاح یکطرفہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یعنی مدارس عوام کی مالی امداد کے محتاج ہیں لیکن عوام اپنی اصلاح کے لئے ان کے نہ محتاج ہیں اور نہ اس پر آمادہ نظر آتے ہیں اور اس ساری خرابی کی ایک وجہ یہ ہے کہ آج یہ مدارس اس زعم میں بری طرح مبتلاء ہیں کہ اصلاح کرنا صرف انہی کا حق ہے۔ عوام کو یہ حق حاصل نہیں کہ اگر وہ ان میں کوئی خامی دیکھیں تو ان کی اصلاح کریں۔

چنانچہ اس عمل نے مذہبی اجارہ داری کی فکر کو ہوا دی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے کہ آج علماء مدارس کے اصلاحی احکامات مدارس تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور عوام پر اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے۔

غرض ارباب مدارس کو آج اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آج کے مدارس اس نظریاتی دارالعلوم دیوبند سے کس قدر دور ہیں جس کی نیو حضرت نانوتویؒ نے اٹھائی تھی۔ اگر دارالعلوم کسی نظریاتی جدوجہد کا نام ہے تو آج یہ مدارس بانجھ کیوں ہو گئے ہیں؟ ان کو

سوچنا چاہئے کہ آج برصغیر کی سب سے بڑی تحریک آزادی (دارالعلوم دیوبند) کے نام لیوا اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام میں اپنا کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟ آج کتنے مدارس ایسے ہیں جو حضرت نانوتویؒ کے اس پہلے اصول پر عمل پیرا ہیں؟ یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ ارباب مدارس دیوبند کی تاریخ اس کے مقاصد اور ان مقاصد کے حصول کے لئے علماء دیوبند کی شاندار اور بے مثال قربانیوں کو اپنے نصاب تعلیم کا حصہ کیوں نہیں بناتے؟

اگر آج مدارس اس نظریاتی دیوبند کے اصول وضوابط وحصول ومقاصد پر عمل پیرا ہیں تو اس کی عملی توجیہ ہو، بصورت دیگر ان بانجھ اداروں کو اپنا تعلق اس عظیم نظریاتی دارالعلوم کے ساتھ جوڑنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

حواشی

۱)۔سید محمد میاں/علماء ہند کا شاندار ماضی/ج۵/ص۴۸/مکتبہ رشیدیہ کراچی۱۹۹۲ء۔

۲)۔سید مناظر احسن گیلانی / احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے ایام/ص۱۷۰/ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان۱۹۹۷ء۔

۳)۔ایضاً ص۱۷۱۔

۴)۔سید مناظر احسن گیلانی/سوانح قاسمی/ ج۲/ص۲۲۳۔۲۲۲/مکتبہ رحمانیہ لاہور۔

۵)۔ایضاً ص۲۲۳۔

۶)۔سید محمد میاں/علماء ہند کا شاندار ماضی ج۵/ص۴۸۔

۷)۔سید محبوب رضوی/تاریخ دارالعلوم دیوبند/ج۲/ص۱۳۰۲/المیزان لاہور۲۰۰۵ء۔

۸)۔مولانا حسین احمد مدنی/نقشِ حیات/ج۲/ص۶۷۷/دارالاشاعت کراچی۔

۹)۔ایضاً۔

۱۰)۔ماہنامہ الولی حیدرآباد/ج۱۴/شمارہ۱۱/ص۲۷/۱۹۹۱ء۔

۱۱)۔سید مناظر احسن گیلانی/احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے ایام/ص۱۷۰۔

۱۲)۔ماہنامہ الولی حیدرآباد/ج۱۴/شمارہ۱۱/ص۲۳/۱۹۹۱ء۔

(تحریر: انس حسان)

شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کی دستیاب مطبوعات

استعماری مظالم اور ملی تقاضے	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
جدوجہد اور نوجوان	شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
قرآنی دعوت انقلاب	مولانا عبید اللہ سندھیؒ
ولی اللّٰہی فکر کا تاریخی تسلسل	مولانا عبید اللہ سندھیؒ
تقویٰ کیا ہے؟	مولانا عبید اللہ سندھیؒ
دین حق اور برصغیر کا سامراجی نظام تعلیم	مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
عبادت وخلافت	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
شریعت، طریقت اور سیاست	مولانا محمد الیاس دہلویؒ، مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
جدوجہد آزادی کا راہنما ادارہ	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
دینی تمدن کی تشکیل نو	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
اسلام اور گروہیت	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
اسلام کا اقتصادی نظام ایک تقابلی جائزہ	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
فرد اور اجتماعیت	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
وقت کی قدر و قیمت	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
ولی اللّٰہی تحریک	مولانا سید محمد میاںؒ
امام شاہ عبدالعزیزؒ افکار اور خدمات	مولانا سید محمد میاںؒ
آزاد قومی پالیسی کا خاکہ	مولانا سید محمد میاںؒ
دین وحدت	مولانا سید سلیمان ندویؒ
جہاد کیا ہے؟	مولانا سید سلیمان ندویؒ
دین اور حکومت	مولانا سید سلیمان ندویؒ

پوسٹ بکس نمبر 938 پوسٹ آفس گلگشت ملتان